فریضۂ اقامتِ دین

از
جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

کسی با اصول جماعت کی زندگی اس کے اصولوں کی زندگی پر موقوف ہے، اگر اس کے افراد میں ان اصولوں کا سچا عشق اور یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھ نہیں دکھا سکتی، یہ عشق اور یقین اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ جماعت دنیا میں ایک غالب، سر بلند اور با عزت جماعت کی حیثیت سے ہی باقی رہ کر رہے گی اور پھر اسی عشق و یقین کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر انقلابی حوادث نے اس کو کبھی یہ دن دکھا دیے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے تاب و بیقرار رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو، اس کو اپنے اصولوں کی محبت موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی، وہ رائج الوقت نظام زندگی کے خلاف سراپا احتجاج اور مجسم اعلان جنگ بن جائے گا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص انہی اصولوں سے وابستہ ہے جن کو اس نظام قاہر نے تہ و بالا کر رکھا ہے۔ پھر یقین ہے کہ یہ جماعت کبھی نہ کبھی اس نظام غیر کے حلقۂ غلامی کو اپنی گردن سے نکال پھینکے گی، اور اپنے اصولوں کا نظام زندگی قائم کر کے دم لے گی، بشرطیکہ اس کی بہ نسبت اس کے اصول زیادہ طاقت اور صداقت کے حامل ہوں اور اس کے پیروؤں کی بہ نسبت اس کے افراد میں اپنے اصولوں کے ساتھ زیادہ گہری عقیدت و فدویت ہو۔

لیکن ایک اجتماعی مسلک رکھنے والی اور با اصول جماعت کے افراد میں اگر کسی دوسرے نظام زندگی کے ساتھ، جو ان پر کسی طرح مسلط ہو گیا ہو، تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا رجحان پیدا ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متاعِ حیاتِ قومی کے محافظین نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں اور اب اس متاع کا لٹ جانا چند لمحوں کی بات ہے، جس کو شاید کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہو تو بچا سکے۔

اس کے بعد ایک تیسرا دور بھی آتا ہے جس میں افراد جماعت، مداہنت اور تعاون کی حدود سے تجاوز کر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انھیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی یاد نہیں رہ جاتا ہے اور وہ اپنے اصول و مقاصد سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف عملاً، اور بطیب خاطر، ان اصولوں کی بیخکنی پر اپنی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف کرنے لگتے ہیں بلکہ اگر کوئی واقف کار ان کی اس خود فراموشی اور خودکشی پر انھیں متنبہ کرتا ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جن اصولوں کے خلاف تم اس وقت صف آرا ہو، وہی تمھاری رگِ حیات ہیں، تو وہ اس کی باتوں کو حیرت کے کانوں سے

سنتے اور انکار و تکذیب، طعن و تشنیع، اختلاف و عناد کی زبانوں سے ان کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے غدار اور نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

دونوں مؤخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد بھی ہلاک و برباد ہو جائیں اور دنیا کی دولت اور سیاست میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے، بلکہ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ عام قوانین طبعی پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کے مالک ہو جائیں لیکن اپنی تمام تر شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود ان اصول و مقاصد کے نقطۂ نظر سے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی، ان کا وجود و عدم برابر ہے، جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو، ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ فرش ذلت پر ہیں یا عرش عظمت پر، ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو قائم و برپا کرنے کی ان کے دلوں میں کتنی لگن ہے اور وہ اس کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنے قوائے ذہنی و دماغی کی کتنی قربانیاں کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو یہ اصول ان سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے اور پھر اخلاق و دیانت کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے انقطاع کا اظہار کر دیں۔ اب ان کے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اصولوں کا نام لیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کریں جو ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب انھیں ملا تھا کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے رہے نہیں۔

اسلام بھی ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے اور "ملت اسلامیہ" یا "امت مسلمہ" وہ با اصول جماعت جس نے اسلام کے دیے ہوئے اصول پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی ہو۔ لیکن زندگی کے دوسرے ضوابط اور اسلام کے ضابطۂ حیات میں ایک فرق ہے، اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے ضوابط زندگی پیش کیے گئے ان سب کی بنیاد انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار اور تجربات پر ہے، اس لیے مزید غور و فکر اور جدید تجربات اور معلومات کی روشنی میں اگر رائج الوقت ضابطۂ زندگی کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو کر لی گئی اور بعض نئے اصولوں کا اس میں پیوند لگا لیا گیا جس پر اس ضابطۂ زندگی کے پرجوش سے پرجوش نمائندوں اور گہرے سے گہرے عقیدت کیشوں نے بھی بسا اوقات کسی احتجاج کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اسلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ میرے اصول اور میرا پیش کردہ مسلک حیات کسی انسان کے ذہن و دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و خبیر کا تجویز کردہ ہے جو واقف اسرار ہے، جو بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات، فطری مطالبات اور انفرادی و اجتماعی مصالح کا صحیح اندازہ داں ہے اور جس کی نگاہ سے انسانی فطرت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک حیات، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جاودانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے اور اگر کسی نے اس مسلک کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی یہ جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہے نہ کہ اطاعت کیشوں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت ہے، لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو یا حقیقت اور گمان میں فرق کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ اگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علم الٰہی ہے تو اس کے کسی نقطہ میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کرنا بدترین سفاہت ہے اور اس مسلک حیات کا ایک جانی دشمن بھی ازروئے انصاف اس کو یہ حق دینے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت اور پیروی کا دم بھرے اور دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو نہ مانے اگر اس کے دعوے کی صداقت میں اس کو تردد ہو اور اس کا مسلک زندگی اس کے نزدیک قابل ترمیم و اصلاح یا ناقابلِ عمل نظر آتا ہو۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور با اصول جماعت کے لیے بالکل متضاد اصول اور طریقۂ زندگی سے تعاون یا مصالحت ممکن ہو تو ہو مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھیے، یہ جماعت بھی آج انحطاط اور تنزل کے دھکے کھاتے کھاتے بالکل اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے اپنے اجتماعی مقصد زندگی کا نام تک یاد نہیں رہا اور خود فراموشی و خودکشی کے عبرتناک مظاہرہ میں سرگرم عمل ہے۔ ابتدا میں، ہر با اصول زندہ جماعت کی طرح، یہ جماعت بھی اپنے اصولِ حیات اور مسلکِ زندگی کا سچا عشق و یقین اور بے مثل جذبۂ جاں نثاری لے کر اٹھی اور اس طرح اٹھی کہ بڑی سے بڑی جانی و مالی مصیبتیں سامنے آئیں، سخت سے سخت خطرات کا مقابلہ ہوا، رات کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو گیا، قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشیں عام ہو گئیں، تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی سزائیں دی جانے لگیں، گھر چھوڑنا پڑا، عزیز و اقارب سے علیحدہ ہونا پڑا، پیٹوں پر پتھر باندھ باندھ کر بھوک کی آگ دبانی پڑی، مگر تاریخ شاہد ہے، اور اس شہادت کی سچائی اور حقانیت کا انکار بڑے سے بڑا دشمن اسلام بھی نہیں کر سکا، کہ ہولناک مصائب کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی اس جماعت نے کبھی اپنے ایک اصول کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نہ وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے پر کبھی راضی ہوئی، حالانکہ اگر وہ ذرا بھی مصالحت اور مداہنت کو راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب سرد پڑ جاتا، شب و روز کی بے اطمینانی امن و سکون سے بدل جاتی، معاشی خستہ حالیاں دور ہو جاتیں، اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے قبول کر لیتا جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کے اجمالی اشارات سے معلوم ہوتا ہے:-

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم ذرا مداہنت برتو تو وہ بھی مداہنت کی پالیسی اختیار کریں

لیکن اس کے پیرو جانتے تھے کہ یہ مداہنت ہمیشہ کی موت ہو گی اور اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے بعد ہمارا وجود، اپنے مقصد کے لحاظ سے، بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بار بار تنبیہ آتی رہتی تھی کہ:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ...... وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ — پس اے پیغمبر! ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ...... اور ان کے معاملات میں اس قانون کے

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (مائدہ - ۷)

مطابق فیصلہ کرو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات نفس کا لحاظ نہ کرو اور دیکھو! ہوشیار رہو کہیں یہ لوگ تم کو اس راہ حق اور ان قوانین ہدایت سے ذرہ برابر بھی برگشتہ کر کے فتنہ میں نہ ڈال دیں جن کو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

اس لیے اس جماعت کے رہنما اور پیکر عزم و یقین پیرو، سب کے سب آگ و خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے۔ اور حالات کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انھیں اپنے مسلک سے یک سر مو بھی نہ ہٹا سکی اور نہ اپنے اصول کے بارے میں انھوں نے وقتی طور پر سہی، مداہنت سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسائل، مادی مصالح، ظاہری تدابیر اور دنیوی مفادسے آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایک جنون ہے جس نے انھیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ بھی ان کے بارے میں یہی تھا کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے) مگر جلد ہی دنیا نے اس "خود فریبی" کا انجام دیکھ لیا اور سیاسیات عالم میں وہ انقلاب آیا جس کی منطقی توجیہ کرنے میں عروج و زوال امم کے نکتہ دانوں کی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت ان کے قدموں میں آپڑے اور پوری ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے براعظموں کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس یقین و اذعان، اور وفاداری و فداکاری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے اصول و مقاصد کے لیے موجود تھی اور جس نے انھیں اپنے مسلک زندگی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد اس جماعت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اصول و مقاصد کے نقوش ماند پڑنے لگے اور مختلف خارجی اسباب کے باعث ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئی، غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں کثرت سے پھیلنے لگے جن کی روک تھام کے لیے علماء حق کی طرف سے بہتری کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر ناتربیت یافتہ عوام الناس کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی فرض ناشناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری آہستہ آہستہ اسلامی اصول کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ لیکن جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا، ان اصولوں کے بارے میں اس نے بحیثیت مجموعی خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ مداہنت اور مصالحت کی پالیسی بجائے خود موت کا پیش خیمہ ہے۔ جس سرچشمہ سے جماعت کی سیاسی طاقت کو غذا ملتی تھی، جب اس سے اس نے اعراض برتنا شروع کیا تو اس کا لازمی نتیجہ سیاسی زوال کی شکل میں نمودار ہوا جس کے بعد ہی اس پر تنزل اور انحطاط کا آخری دور شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو پہچانتی بھی نہیں، اس کے افراد کی غالب ترین اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو اس کے سامنے رکھا جائے تو نہ صرف ان سے اجنبیت اور بیگانگت محسوس کرتی ہے بلکہ پوری طمانیت قلب اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جو چیز ان اصولوں کی عین ضد ہے اس کو اسلام کا منتہائے مقصود قرار دینے پر مصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر جدوجہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی پر مرکوز ہے اور خوش فہمی یہ ہے کہ یہ اسلام اور جماعت مسلمین کی سرفرازی کا باعث ہوگا۔ وَهُمْ

يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

ایک تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے، اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے، وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہے۔ مگر یہ یاد محض ایک "متبرک یادگار" بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو مفقود ہو چکی ہے یا اتنی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ۔ حالات کی ناسازگاری، مخالف قوتوں کی قہاری اور ماحول کی نامساعدت نے سروں میں وہ سودا باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی اصول یا مقصد کا نام لینا ہی حرام ہے۔ ان لوگوں نے مداہنت اور مصالحت کی پُرامن روش اختیار کر رکھی ہے اور اس امر کی پوری احتیاط کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان پہ سیاست و تدبر کی زبان سے عَنْ خَوْضِهِمْ كَالَّذِي ضَرَّهُمْ کی پھبتی نہ کس دی جائے۔

ان حالات میں یہ جماعت اگر دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی بحث اور دلچسپی نہ ہوتی اور نہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا، اس کو تو جو کچھ بحث و دلچسپی ہے صرف اپنے نصب العین کی اقامت سے ہے۔ اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اگر اس کے نام لینے والوں نے دولت کونین بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر بدقسمتی سے یہ چیز بھی آج اس جماعت کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے اصول زندگی کو ترک اور فراموش کر کے جو کچھ پایا وہ ذلت اور محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی — حزب اللہ — کی پیشانی پہ کبھی نہیں لگ سکتا۔

قرآنی فلسفۂ عروج و زوال امم یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو آجکل عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بار بار کھٹکتا اور ان کے لیے بڑی حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے، وہ وہ کہ یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے، ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں، ہم احکام دین سے غافل ہیں، یہ سب کچھ صحیح، مگر پھر بھی ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں، ہم اگر اپنے سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں، اس کے رسول کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردن میں ہے، اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں — اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کا فرد مشرک ہے، خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے، رسول کی نعت اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولتمند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحب اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمراں۔ حالانکہ ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں اس لیے ان کے مقابلہ میں ان الٰہی انعامات کے ہم زیادہ مستحق تھے نہ کہ وہ!

یہ سوال عروج و زوال امم کے اس فلسفہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کشمکش حیات میں دو قسم کے قوانین مصروف عمل ہیں، ایک تو قوانین طبعی، دوسرے قوانین اخلاقی[1] قوموں کے ابھارنے اور گرانے میں یہ دونوں

[1] اخلاق سے ہماری مراد قرآنی اور دینی اخلاق ہیں۔ نہ کہ افادی و تجربی اخلاق، ورنہ افادی اور تجربی اخلاق سے عاری ہو کر (بقیہ بر صفحہ ۵۵)

ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں، مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں قدرت نے یہ قوت نہیں رکھی کہ وہ تنہا کسی قوم کو اٹھا کر تخت سلطانی پر بٹھا دیں۔ قوانین اخلاق کو قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار (Veto Power)" کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو زیادہ اسباب و ذرائع جنگ کے ساتھ میدان مقابلہ میں آیا ہوگا اور اگر ایک طرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے، لیکن اگر مادی قوتوں اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی آلات سے بھی مسلح ہے تو اس کا غالب ہونا بھی یقینی ہے بلکہ قرآنی تصریحات تو یہ بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل کے اعتبار سے وہ فروتر بھی ہو، حتیٰ کہ اگر فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی غیبی اور مافوق الفطری اعانتیں اس کو کامرانی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں، لیکن شرط یہی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے امکان اور مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف قرآنی مطالبات کے مطابق اپنے ایمان کو راسخ اور اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یعنی یہ کہ اس میں اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ تائید غیبی اور اعانت مافوق الفطری کا یہی وعدہ ہے جو قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے:۔

(۱) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (انفال-۸)
اور کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ بازی لے گئے۔ نہیں وہ ہم کو عاجز نہ کر سکیں گے۔

(۲) كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ
کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر بحکم خدا، غالب ہوئی ہیں۔

(۳) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال-۸)
اے نبی تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور تمہارے پیرو مسلمانوں کے لیے۔

(۴) لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران-۴)
نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۵) إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ
یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔

(۶) وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مائدہ-۸)
اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا (وہ بامراد اور سربلند ہوگا) کیونکہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہنے والی ہے۔

اس اعانت غیبی کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں، خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "غیر مرئی افواج" نے جو کچھ کیا اس پر قرآن تک کی شہادت

(بقیہ صفحہ ۵۳) محض قوانین طبعی کے بل پر بھی کوئی قوم فتح و غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں ہم نے انفرادی اور تجربی اخلاق کو بھی قوانین طبعی کے ضمن میں شمار کیا ہے کیونکہ یہاں عام اقوام کے عروج و زوال سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ امت مومنہ کے عروج و زوال تک یہ بحث محدود ہے۔

موجود ہے، جس کا انکار کرنے کے لیے پہلے قرآن کا انکار کر لینا ضروری ہے۔

نعمت بقدر رحمت لیکن جہاں اس جماعت کو قدرت کی یہ خصوصی نظرِ عنایت حاصل ہے، وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں، اور اس کو اس وعدۂ خاص کے ساتھ ایک وعید خاص بھی سنا دی گئی ہے جس کی طرف سے اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں لیکن یہی کان بند کر لینا اس کے لیے بڑی غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بن گیا اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں، اس کی محبوبیت اور مبغوضیت، اور اس کی جزا و سزا کا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، اس فضل و کرم کی ناشکری اور احکام الٰہی سے بغاوت کے وقت اس کی گرفت بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے، اور محکومی و نامرادی کی جو سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے، انھی برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے انعامات سے سرفراز ہو۔ اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندہ جو عالم وجود میں آیا وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات سے نوازا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے اور جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل کر دی، مگر ساتھ ہی انھیں یہ بات بھی سنا دی گئی تھی کہ:۔

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (بنی اسرائیل ۸)

اگر ہم تم کو اس پر ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے (اگر ایسا ہوتا تو) یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر تم ہمارے مقابل کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

ازواج مطہرات کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (یَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ) اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدق دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دگنا اجر ملے گا (وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا (احزاب۔ ۴) وہیں اس حقیقت سے بھی انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (احزاب۔ ۴)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر انعامات الٰہی کی بارش ہوتی رہی، جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا، جس کی معاشی مشکلات کے وقت من و سلویٰ کا نزول ہوتا رہا اور بقول بائبل، جس کی بیاباں نوردی کے وقت خود خداوند عالم بدلیوں کی شکل میں اس پر سایہ کرتا ہوا چلتا، اور جس کو، بقول قرآن، تمام اقوام عالم پر فضیلت دی گئی تھی لیکن جب اسی محبوب اور لاڈلی قوم نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا، اپنی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا، احکام الٰہی سے سرتابی کر بیٹھی اور فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب اس طرح ٹوٹ پڑا جس کی نظیر پیش کرنے سے پوری تاریخ انسانی قاصر ہے۔ جتنی یہ قوم سربلند تھی اتنی ہی ذلیل ہو گئی، جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو گئی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی "نعمت بقدر رحمت" ہوا کرتی ہے اور یہ سنت بالکل مطابق فطرت ہے، ہم ایک اجنبی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے، ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار غلام یا ناز پروردہ بیٹے کی طرف سے وجود میں آئے تو اس وقت ہمارے غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے، لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفتِ حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی ہے، جو ضمیر انسانی کی سب سے بڑی اور گھناؤنی رذالت ہے۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو، جو اس کی عنایات اور افضال کا مورد ہونے کے باوجود، اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں، عام حالات کی بہ نسبت دگنی سزائیں دیتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں ایک تو مخالفتِ حق کی، دوسرے نمک حرامی کی۔

ہماری موجودہ حالت امت مسلمہ کو اسی سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو وہ ساری نعمتیں بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام اقوام کو دی گئی تھیں اور اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی قوم کو نہیں ملی تھیں؟ آخر یہ سارے عالم کی امامت کا منصب[۱۵] اور خیر الامم[۱۶] کا خطاب، یہ امت وسط[۱۷] اور شہداء علی الناس[۱۸] کے القاب، یہ اکمال دین[۱۹] اور اتمام نعمت[۲۰] کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ یقیناً نہیں۔ پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہیں اور ان ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جو قانون خداوندی اپنے محبوب پیغمبر اور اس کی محترم ازواج کے لیے اس طرح تیغ بے نیام تھا وہ دوسروں کے بارے میں کب کوئی نرمی دکھا سکتا ہے۔ پس یہ امت آج اپنے کو جس حال میں پا رہی ہے وہ اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ حیات عطا فرمایا تھا اس ضابطہ کا نام دین الحق ہے اور اس کی تفصیلات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہ قرآن اپنے کو اس میثاق کی دستاویز قرار دیتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے اور جس کی پابندی کا ہر مسلمان نے اپنے رب سے معاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو بندوں کے لیے ایک نعمت قرار دے کر اور یہ بتا کر کہ تمہاری کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی میثاق کی پابندی پر ہے، فرمایا ہے کہ:۔

---

[۱۶] كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ الخ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے، تم کو نیکی کا حکم دینا چاہیے الخ۔ [۱۷] وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور درمیانی امت بنایا تاکہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو) أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں۔)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (مائدہ - ۲)

اور اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس میثاق کو نہ بھولو جس کو اس نے تم سے باندھا ہے، جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

تمام احکام قرآنی اسی معاہدۂ عبد و معبود کی دفعات ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق حکم ہے کہ اس کو پورا کیا جائے اور ہر حال میں ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کی جائے۔ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ اے ایمان لانے والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو) پھر ایک جامع ہدایت یہ کر دی گئی کہ:-

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف - ۱)

تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا اسی کی پیروی کرو، اور اس کو چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔ (خواہ یہ خداوندان اصنام ہوں، خواہ امراء و ملوک، خواہ آباء و اجداد ہوں خواہ اپنا نفس)

قرآن کے اس مطالبہ کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جا سکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے یا پھر غیر مشروط طریقہ پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور ہر اس پابندی کو عملاً قبول کر لیا جائے جو رب کائنات کی طرف سے نازل اور عائد کی گئی ہو۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس واضح حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ شخص بدترین جہالت اور سفاہت کا ثبوت دے گا جو بعض پابندیوں کو تو مانے اور بعض سے گریز کرے۔ یہ پوزیشن عقل انسانی کے نزدیک بھی بالکل مضحکہ خیز اور ناقابل تسلیم ہے اور قرآن کے نزدیک بھی۔ چنانچہ قرآن اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو یہ بین بین کی روش اختیار کرتے ہیں، ان لفظوں میں زجر و ملامت کرتا اور اس کے خوفناک نتائج سے یوں متنبہ کرتا ہے:-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (بقرہ - ۱۰)

کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اس قانون جزا کی زندہ شہادت ہے۔ ان کو خدا نے ایک کتاب دی تھی اور اس لیے دی تھی تاکہ اس کے احکام کی پابندی کریں اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اپنی زندگی کا نظام چلائیں۔ مگر انھوں نے اس کتاب کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ایک طرف تو اس میں تحریف کرنے لگے۔ دوسری طرف جو کچھ تعلیم باقی رکھ چھوڑی تھی اس کے بھی ایک بڑے حصہ کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:-

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (مائدہ - ۳)

یہ لوگ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں اور جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھلا چکے ہیں۔

"بھلا دینے" کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ ان کے حافظہ سے محو ہو گیا تھا۔ نہیں، وہ تو تحریری شکل میں موجود تھا۔ اور کتاب الٰہی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے، نہ کہ حفظ کرنے کے لیے، سو اصل مقصود اس کتاب سے وہ بخوبی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کے اجارہ دار فریسیوں نے کیا یہ کہ مختلف سیاسی، معاشی اور دوسری اغراض و مصالح کے

پیش نظر بہت سے احکام کو معطل کر دیا، کتنے ہی قوانین تھے جن کو فاسق امرا کی خاطر بدل کر نرم بنا ڈالا اور کتنی ہی آیتیں تھیں جنکے مطالب و مقتضیات کو دوسروں سے چھپا کر رکھتے اور معاملات زندگی میں ان کو زیر بحث آنے ہی نہ دیتے۔ قرآن مجید نے ان کی اسی مجرمانہ حرکت کا اعلان کیا جب اس نے کہا:۔

..... تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (انعام - ۱۱)

جس (توراۃ) کو تم متفرق اوراق میں رکھکر لوگوں کو دکھاتے ہو اور (اسکے مطالب و احکام کا) بڑا حصہ چھپا جاتے ہو۔

پھر اسی چیز کو ایک دوسرے انداز میں یوں کہا کہ:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (آل عمران - ۱۹)

اور یاد دلاؤ اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ دیکھو! تمھیں اس کتاب کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا ہوگا اور اسے چھپا کر نہ رکھنا۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا

"پس پشت ڈال دیا" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس موجود تھی مگر جب زندگی کے معاملات سامنے آتے تو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جزدانوں میں لپیٹ کر کہیں حفاظت سے رکھے رہتے۔

کتاب الٰہی کے ساتھ ان کا یہی طرز عمل تھا جس کو فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی تفسیر یہود کے ان اخلاق ذمائم اور شیطانی اعمال سے ہوتی ہے جن کی تفصیل سے قرآن بھرا پڑا ہے، گویا عملی طور پر وہ توراۃ کے ایک حصہ کا انکار کر رہے تھے جس کا انجام اس ذلت اور مسکنت کی صورت میں نمودار ہوا جو خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی سب سے نمایاں مثال ہے۔

غرض قرآن کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے یعنی جو کچھ بھی وہ کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے تبعین کے لیے جو حدیں، زندگی کے مختلف شعبہ جات میں قائم کر دی ہیں، ان سے آگے قدم اٹھانے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو یا اس کے کسی ادنی سے ادنی جزو کو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج صورت واقعہ کیا ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ پر اول سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی کا گہرا جائزہ لیجیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے اور ہوائے نفس کے اتباع میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقوی اور ایمان و عمل کے لحاظ سے مردان کامل کہے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان لوگوں کی زندگی [illegible] ان احکام الٰہی کے [illegible] ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے، نماز اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے، اوراد و وظائف کی کثرت ہے، زکوۃ و صدقات بھی

ادا ہو رہے ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ نہیں ہونے پاتی۔ کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت، بدعہدی، ظلم و غصب، رشوت و حرام خوری اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ باقی رہے اجتماعی احکام و مسائل، سو یہاں بھی ان سے غفلت اور بے اعتنائی کا وہی حال ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباعِ قرآن کا حق ادا ہو جاتا مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے انفرادی مسائل کو۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے، اور دیانت، امانت، اخلاص، وفائے عہد، حسن سلوک، اکل حلال اور صدق مقال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور حاکمیت و فرمانروائی کا مستحق نہیں اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو۔ (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو)۔ خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعاوی تسلیم کرنے سے انکار کر دو جو خدا کی بادشاہت کے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (وَلَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔ (فَاحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ) اور جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انھی احکام کے ماتحت کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لیجانے والا منافق ہے (یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق، اور کافر ہے (وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ .... الْفٰسِقُوْنَ .... الْکٰفِرُوْنَ)۔ کسی برائی، کسی ظلم اور کسی عدوان کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو (وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے (وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے وہ اللہ اور اس کے رسول کا محارب ہے، اس کو قتل کر دو (اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا الخ) جو چوری کرے اس کے ...... ہاتھ کاٹ دو (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا)۔ جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو (اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ) جو کوئی کسی پاکدامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی درے لگاؤ۔ (وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے، اس کی بھی گردن اڑا دو (یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ)۔

یہ ان بہت سے احکام میں سے چند ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو بطور مثال یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں، اس لیے اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا اقرار کیا ہے، یہ سارے احکام بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسرے احکام کے

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی اساسی اہمیتوں کے پیش نظر ان میں سے اکثر احکام تو ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں اور ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق لیکن خالص "دینی اور متقی" حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار، عمل کی خواہش کا وجود بھی عنقا ہے۔ [آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے ارباب امر و حکم وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم علی الاطلاق کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو "مسلمان" ہیں لیکن ایسے مسلمان جنھوں نے اللہ کے ان حقوق فرمانروائی کو، جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے، اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ ان دو قسم کے اربابٌ من دون اللّٰہ کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے بنیادی مسائل میں سے اس مرکزی مسئلہ میں کہ انسان کا اصل حاکم اور قانون ساز کون ہے، اس امت نے پہلے مداہنت اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا اصل آمر و ناہی تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر قرآنی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے اصول زندگی، اس کے نظریات سیاسی، اس کے تصورات معاشی اور اس کے افکار عمرانی کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب اس کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت میں اعتقاد ہے اب وہ اس نظام زندگی کو، جو اپنے اصول و فروع میں سرتاپا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے، نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے۔ اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، سرقہ، زنا، قذف اور قتل کے جرائم کی پاداش کہیں بھی قتل، قطع ید، جلد اور قصاص و دیت کی شکل میں نہیں دی جاتی حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور حلف وفاداری اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات اور حدود کو قائم کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے جس کو اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کے اندر تعلیمات قرآنی کا حقیقی فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو اور تاویلات و تسویلات نفس نے اس کی روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلا نہ دیا ہو تو وہ بیک نظر محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن کے ساتھ بڑی حد تک وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اہل کتاب نے تورات اور انجیل کے ساتھ کیا تھا] چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گذشتہ صحف سماوی کی طرح اس کتاب میں بھی لفظی تحریفات ہو جاتیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو

اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے قرآن کے ایک حصہ کو فراموش کر دیا ہے، در اصل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے اور کچھ اقرار او۔ کچھ انکار کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ اور فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ نیز اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا الزام، ایک محدود معنی میں سہی، ان پر عائد کرے اور اس انجام تک نہ پہنچائے جو اس کا قانون چاہتا ہے۔

شاہراہ نجات اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا علاج کیا ہے اور اس ملت نے اپنے آپ کو آگ کے جس گڑھے میں لا ڈالا ہے اس سے نکلنے کی سبیل کونسی ہے؟ اس سوال کا حل بھی ہم کو اسی کتاب کا قبول کرنا چاہیے جس کو ہم سچی ہدایت اور یقینی علوم کا تنہا منبع قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی، اس وقت پرانی آسمانی کتابوں کے پیرو، یہود و نصاریٰ، کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے، جیسا کہ اوپر کے اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے ان کی گمراہیوں اور اعتقادی و عملی بے عنوانیوں، نیز ان کے نتائج بد کا تفصیلی ذکر کیا تو ان کی رگوں میں جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی اور ضد میں آ کر انھوں نے صدائے حق کے استیصال و ابطال کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیاسی اور جنگی کوششوں کے علاوہ مناظروں اور مجادلوں کے معرکے بھی گرم کرنے لگے۔ ان تمام ہنگاموں کے پیچھے کچھ تو جاہلی عصبیت اور جوش عناد کار فرما تھا اور کچھ آسمانی مذاہب رکھنے کا نازِ بے جا اور ابناء اللہ اور احباء اللہ ہونے کا فریب نفس۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بے اصل دعاوی اور ان کی کٹ حجتیوں کے جواب میں فرمایا:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ: ۱۰)

اے پیغمبر ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے قائم نہ کرو

یعنی تم اپنی موجودہ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ دعوت حق کے بارے میں کلام کر سکو، تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان تمام ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے، ان کو نافذ کرو، جن اصول و عقائد کو تمہارے سامنے رکھا گیا تھا، ان پر جم جاؤ، اور دین کی جن صداقتوں کا تمھیں علم دیا گیا تھا، ان کی حفاظت و بقا اور تبیین و اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کر لو۔

پھر اس دینی و دنیوی ہلاکت سے جس کو ان لوگوں نے اپنی بدکرداریوں اور غلط کاریوں کے عوض خرید رکھا تھا، نجات کی جو شاہراہ قرآن نے تجویز کی وہ یہ تھی:-

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ

اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

(مائدہ [illegible])

برائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان (ہدایتوں اور کتابوں) کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، قائم رکھتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔

مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو۔ ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی، آپ نے دیکھا کہ اہل قرآن کے یہاں بھی اسی راہ سے آئی، اس لیے ضرور ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقہ سے حاصل کی جائے جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی بات کے سامنے کسی اور کی رائے سننے اور ماننے کے ہم مجاز نہیں ــــ کہ اہل کتاب نے کتب الٰہی کے کچھ حصوں کو ترک اور فراموش کر دیا، جس کا نتیجہ، رحمتِ الٰہی سے بُعد اور غضب الٰہی کے نزول کی شکل میں نمودار ہوا، جس سے بچاؤ کی واحد شاہراہ انہی کتابوں کا "قائم" کرنا تھا اور اب اس قرآن کو ملنے اور "قائم" کرنے میں ہے۔ اگر ہمارے دل و دماغ قرآن حکیم کے اشارات سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں، تو ہمارے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں جو اس کے اس کھلے ہوئے اشارے میں موجود ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے گوشِ عبرت بخشا ہے وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ:۔

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے۔ اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔"

نیز :۔

"اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو "قائم" نہ کرو۔

"قائم کر دینے" یا اقامت کے لفظی معنی ہیں سیدھا کرنے اور کھڑا کرنے کے، جب مجسمی اشیا کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی کجی دور کر کے اس کو سیدھا بنا دیا یا اس کو کھڑا کر دیا، لیکن جب معانی کیلیے اس کا استعمال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کو کامل اعتنا کے ساتھ اس کی مکمل ترین اور حسین ترین شکل میں اس طرح پورا کر دیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بازار کی "اقامت" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو اس تمام ضروری ساز و سامان اور حسن انتظام سے مالا مال کر دیا جائے جس کا بازار میں ہونا ممکن ہے۔ نماز کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دواماً اس کو ظاہری آداب اور باطنی محاسن سے اس طرح آراستہ رکھا جائے کہ کہیں کوئی نقص نہ باقی رہے اور نماز کا جو مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جائے۔ پس اقامت قرآن کا مدعا یہ ہوا کہ اس کے جتنے احکام ہیں، سب کے سب نافذ ہوں، اس کے جتنے اصول ہیں ان سب کو اور صرف انہی کو مدار زندگی بنا لیا جائے، اس کی کسی ہدایت سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے، زندگی کے ہر مرحلہ میں، ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں صرف وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے جو اس نے دیا ہے۔ اور پوری سوسائٹی پر وہ رنگ چھا جائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ پورا ماحول قرآنی اور یہ پوری سوسائٹی ایک متحرک قرآن کی صورت میں نظر آئے۔ اسی کا نام اقامت قرآن ہے جس کو ہم اقامت دین بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ

جو کچھ قرآن میں ہے اسی کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ اس لیے اقامت قرآن اور اقامتِ دین در اصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

پس اقامت قرآن یا اقامت دین ہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے آنے والے امراض کو دور کرنے کی خاطر پہلے ہی سے تجویز فرما دیا تھا، اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ شے ہے جس پر تمھاری دنیوی فلاح، تمھاری اخروی سعادت اور تمھارے ملی تشخص، ان تینوں چیزوں کا انحصار ہے۔ تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا۔ ورنہ باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہے، جہاں سوائے حیرانی اور سرگشتگی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گویا پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دیا ہے جہاں سے ہم ہٹ آئے ہیں۔ اس لیے کہ پہلے بھی تو یہی اقامت دین ہماری زندگی کا تنہا وظیفہ تھا، چنانچہ کہا گیا تھا کہ:-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ..... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم-۳۰) — سو تو اپنے رخ کو یکسو ہو کر دین (اسلام) کی طرف سیدھا کر..... یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ خطاب پیغمبر کی طرف، اور اس کے توسط سے ایک ایک فرد امت کی طرف ہے۔ اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر ایک قانون، ہر ایک ضابطہ اور ہر ایک طرز زندگی سے منہ موڑ کر اپنی تمام اطاعتوں کو اسی ایک طریق حیات یعنی دین اسلام کے لیے مخصوص کر دو اور دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ ہر لمحہ تمھاری نگاہیں اسی دین کے اشاروں پر لگی رہیں اور تمھارا رخ اسی دین کے احکام و مطالبات کی طرف متوجہ رہے۔

پھر اس امت کے وجود کی غایت، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو، یہ بتائی گئی تھی کہ:-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ-۱۷) — اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ بنو۔

یعنی اس حق پر جو پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، صرف اپنے طور پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے سامنے اپنی زبان اور اپنے عمل اور بوقت ضرورت اپنے مال و جان سے اس حق کی گواہی دینا تمھارا فرض منصبی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ — تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوع انسانی کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ اس امت کا مقصد حیات اور اس کا نصب العین صرف یہی متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام اقوام عالم کو حق کی طرف بلائے، معروف کو پھیلائے، نہ صرف پھیلائے بلکہ بزور حکم اسے نافذ کرے اور بدی کے خلاف نہ صرف وعظ و تلقین کرے بلکہ اسے حکماً روک دے۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کے دین کو قائم اور سب کو اسی کا محکوم بنا دے۔ کیونکہ جس "حق" کا گواہ بنا کر اسے بھیجا گیا ہے وہ اسی "دین حق" کا نام ہے اور جس "معروف" کے نافذ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے وہ انہی اوامر کا نام ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں یا ان کے الفاظ سے مستنبط ہوتے ہیں اور جس منکر کے استیصال

کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو احکام و شرائع دینی کے خلاف اور مزاج شریعت کے ناموافق ہیں۔

مقصد حیات اور نصب العین کی اس تعیین کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس امت کو جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہو گے اور تمہارے مقابلہ میں تمہارے اعداء کا انجام شکست اور محکومیت ہوگا تو اسی کے ساتھ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ یہ مشروط وعدہ ہنگامی نہیں بلکہ ابدی تھا جس کی شہادت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق پیشینگوئی فرماتے ہوئے کہا تھا کہ الائمۃ من القریش ما اقاموا الدین (خلفا قریش میں سے ہوتے رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرتے رہیں)

اس ساری بحث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

اولاً یہ کہ اس امت کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا، ثانیاً یہ کہ اس فریضہ کو انجام دینے پر اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال ہوئیں اور وہ دنیا میں بے مثل قوت و اقبال سے سرفراز ہوئی۔ ثالثاً یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا انحصار محض طبعی اسباب و قوانین پر نہیں ہے، بلکہ اخلاقی قوانین پر، یعنی اس فرض ہی کے بجا لانے پر ہے جو اس کے وجود کا تنہا مقصود ہے، اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کیا تو دوسری اقوام کی بہ نسبت وہ اللہ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہوگی۔ رابعاً یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات، کتاب اللہ کو عملاً ترک اور فراموش کر دینے اور اقامت دین کے فرض سے بالکل غافل ہو جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ خامساً یہ کہ از روئے قرآن اس امت کی موجودہ ذلت و نکبت کا علاج اپنے فرض کو دوبارہ پہچان لینے اور اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے دین کو از سر نو قائم کر دینے میں ہے۔ سادساً یہ کہ اگر اس امت نے اپنی موجودہ شکست، درماندگی اور ذلت و محکومی کو دور کرنے کے لیے اقامت دین کی راہ سے الگ کوئی راہ اختیار کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی بلکہ اس کو زندگی کی عظمتوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اور دور پھینک دیں گی اور وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں، دین کا سر رشتہ چھوڑ کر اور اس کی اقامت کا فریضہ فراموش کر کے، کبھی بھی گوئے سبقت نہیں لے جا سکتی۔ اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو ملے گی بھی تو غیروں کا عطیہ ہو گی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہوگا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

فرض ناشناسی اور حقائق سے چشم پوشی

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر، ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے، ہر تسویل نفس اور ہر وسوسۂ شیطانی سے دل کو پاک کر کے اور سود و زیاں کے تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر اس صراط مستقیم اور اس شاہراہ نجات پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اس

دین حق کے قائم کر دینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے، ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن اپنے اس نصب العین اور مقصد زندگی میں ترمیم کرنا یا اس کو ملتوی کر دینا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بہی خواہ رہبر چلا چلا کر ادھر جانے سے منع کر رہا اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہبر کی باخبری، اس کی راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہے اور ساتھ ہی دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ محض اس بنا پر کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند محسوس ہوتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج یہ پوری امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کو یہ راہ بظاہر سہل اور ہموار اور دل کش نظر آتی ہے گرچہ وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم تک منتہی ہوتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے اقدام اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ راہ مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو ہلاکت کی تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ یہی تو ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے، اس سے کس کافر کو انکار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعاوی کی بنیاد وہم و گمان اور خرص و تخمین پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب! قرآن کہتا ہے کہ میرے پاس اور صرف میرے ہی پاس علم حقیقت ہے۔ میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، نجات انسانی کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے، وہ جواب دیتی ہے کہ بلاشبہ! قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے، وہ سب باطل ہے، جو میرے خلاف ہے وہ سراسر جہل ہے، جو مجھ سے ہم آہنگ نہیں اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں، وہ جواب دیتی ہے کہ بالیقین! ـــ لیکن جب وہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک پیام ہے، اقامت دین کا پیام، تو اس کی زبان، جو اب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق کرنے میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا دماغ حیلوں اور تاویلوں کا ایک لشکر تیار کر کے سامنے آجاتا ہے تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مجرم انسان، اگر اس کے اندر غیرت اور عزت نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ یا تو اس غیرت اور عزت نفس کی بیدار حس اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا

کرے اور اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو دے، یا پھر اس حس کے کمزور ہونے کی شکل میں، اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق اور صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اس کو بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کا ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کو ایسا ہی محسوس کرا دے۔ تاکہ اس کے داغِ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔

قرآن کی علم بردار اور دین اسلام کی پیروی کا دم بھرنے والی امت اپنے فریضۂ ملی اور مقصدِ زندگی کی بجا آوری میں کچھ اسی قسم کے مجرمانہ ادعائے بےگناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساسِ خودی کو بری طرح مجروح کر ڈالا اور ان جذبات عزم و ہمت سے سینوں کو ویران کر دیا ہے جو ایک نصب العین کی اقامت کے لیے ضروری ہیں۔ اور نصب العین بھی اقامت دین کا نصب العین، جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے۔ اس کے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی مافات کی کوشش کرتی اور اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھا لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی، اور طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس فرض کو دبا رہی ہے

گریز کی راہیں آیئے ان تاویلوں کی یا ان کے پیش کرنے والوں کے بقول ان محکم دلائل کی حیثیت اور حقیقت پر غور کریں جو اس ترک فرض کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک ایماندار اور صداقت شعار انسان کے لیے پورے قرآن پر عمل کرنا کسی حال میں بھی ناممکن نہیں، اور جن کو اللہ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی پورے دین پر عامل ہیں اور دوسروں کو بھی "امر بالمعروف" کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن کے وہ احکام جن کا تم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کا تعلق حکومت اسلامی سے ہے اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولو الامر ہیں، عوام نہیں ہیں اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ اوامر ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عامۃ المسلمین سے ہے، لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت وغیرہ سے اجتناب تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں اور بحالت اضطرار ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصہ کو ترک یا فراموش کر دینے کا الزام سراپا بہتان ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ از روئے کتاب و سنت ملت اسلامیہ کا فرض یہی ہے، لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں، اس لیے اس وقت اس کے لیے جد و جہد کرنا وقت اور قوت کو

ضائع کرنا ہے۔ اور اس کا اعلان و اظہار کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور عدمِ تدبر کی دلیل ہو بلکہ عافیت کے لیے سراسر مضر اور مہلک ہے۔ اس لیے سردست کچھ ایسی دوسری تجاویز اختیار کی جائیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربات سے مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو ساتھ ہی آگے چل کر ہمارے اصلی مشن کے لیے حالات نسبتاً کچھ زیادہ سازگار کر دیں اس وقت اس کے لیے براہِ راست جد و جہد شروع کی جائے گی۔

ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صفائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ نصب العین بالکل برحق ہے مگر ہم صدیقؓ اور فاروقؓ نہیں ہو سکتے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو تذبذب کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کو ملت کی موجودہ اجتماعی معصیت اور اس کے واحد نصب العین سے انکار نہیں، مگر پہلے وہ دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس نصب العین کے داعی اور مبلغ عمل کے میدان میں کتنی تیز گامی اور ثباتِ قدمی دکھاتے ہیں۔ چونکہ انھیں اس امر میں شک ہے کہ آزمائشوں کے وقت یہ اقامتِ دین کے مدعی میدان میں جمے رہیں گے، اس لیے ان کے لیے اس جد و جہد میں شریک ہونے کا ابھی کوئی سوال نہیں۔

ایک بہت بڑا گروہ حضرت امام مہدی کے ظہور کا منتظر ہے، اس کو اس نصب العین کے برحق ہونے کا پورا یقین ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے مکلف ہم نہیں ہیں، اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ دردِ سر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گیا وہ گروہ جو دین کے حلقہ کو اپنی گردن سے اتار کر پھینک چکا ہے اور جو اپنے مسائلِ زندگی میں قرآن و سنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، تو اس کے خیالات سے ہم اس وقت تعرض نہیں کرنا چاہتے ہمارے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں شریعت کی ہدایات اور احکام کے سوا کسی اور حجت اور سند کے محتاج نہیں۔

اسلام کا طرزِ عمل

لیکن اس لمبی بحث کو شروع کرنے اور ان افکارِ پریشاں پر تبصرہ کرنے سے پہلے باتش کے ساتھ اسلام کی ایک اصولی ہدایت ذہن نشین کر لینی چاہیے جو ہماری زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر دلیلِ راہ کا کام دیتی ہے اور التباسِ حق و باطل کے تاریک سے تاریک مواقع میں بھی اسلام کی صراطِ مستقیم آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس اصولی ہدایت کو سمجھ لینے سے اس بحث کی بے شمار الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے ہم کو حق کی پیروی اور باطل سے اجتناب کا حکم دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ:-

لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر ولتاخذن علی ید المسیئ ولتاطرنہ علی الحق — تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہنا اور بدی سے روکتے رہنا، بدکار کا ہاتھ پکڑ لینا اور اس کو حق کی طرف موڑ دینا۔

اور اگر اس فریضہ کو نہ ادا کیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے بھی خبردار کر دیا گیا ہے۔

او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض ولیلعنکم کما لعنہم — ورنہ اللہ تعالیٰ باطل پرستوں اور بدکاروں کے دلوں کا زنگ معصیت حق پرستوں کے دلوں پر بھی چڑھا دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کر دے گا

ایک دوسری حدیث میں اس نہی عن المنکر کے طریق کار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان — تم میں جو کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے۔ اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

ان ارشادات میں ہم کو اپنی حیات ایمانی کے چند اساسی اصول ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ منکر سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال کرتے رہنا بھی ایک فریضۂ دائمی ہے۔ دوسرے یہ کہ منکر کو برداشت کرنا۔ اس سے رغبت رکھنا نہیں بلکہ اس کو برداشت کر لینا ہی اجتماعی ہلاکت کے خطرہ کا لازم ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں منکر سے نفرت اور اس کو حق سے بدل ڈالنے کی تڑپ نہیں تو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو اصول و نصوص کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ اٹھ جائے جس کو سہولت پسندی اور ضعف عزم اور قلت احساس فرض کے ہاتھوں نے حقیقت کے چہرے پر ڈال رکھا ہے۔

(۱) کیا موجودہ عمل بالقرآن کافی ہے؟ اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے یا ان کے ماسوا جو احکام ہیں وہ نعوذ باللہ محض "بھرتی کے مضامین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں قائم کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں، لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض احکام کو تو مانے اور بعض سے اغماض کر جائے۔ آقا کا حکم بہر حال حکم ہے جو ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ آپ نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے دو حکم آتے ہیں ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرے یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر آپ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتے ہیں تو آپ اپنے اس طرز عمل کو آقا کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام — قرآن — کی پوری پابندی کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام بالکلیہ متروک و مہجور ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی آپ کو خوش فہمی ہے کہ ہم عمل بالقرآن کے مطالبہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ آخر ایک مومن کا ضمیر اپنے فرض کی ادائگی پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ وہ اپنے اوپر اور اپنے گرد و پیش معصیت کا تخت خداوندی بچھا ہوا پاتا ہے اور معبود حقیقی کے بے شمار احکام کو معطل اور اس کی قائم کی

ہوئی حدود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس طاغوتی خداوندی کے تخت کو الٹ دینے، معطل شدہ احکام الٰہی کو نافذ کر دینے اور حدود اللہ کے توڑنے والوں پر ان تعزیرات کے جاری کرنے کا عزم اس کو ادائے فرض پہ آمادہ یا کم از کم بے چین نہیں کر دیتا جن کے جاری کرنے کا حکم اسے ملا ہے۔

عذرِ گناہ اس کے جواب میں جو عذر پیش کیے جاتے ہیں وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے شاہکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف و مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کی تکلیف ہی ساقط ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا زانی کو کوڑے مارو بلکہ فَاقْطَعُوْا، فَاجْلِدُوْا وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جن کے مخاطب سارے اہلِ ایمان ہیں۔[۱] اور جن پر عمل کرنے کی اصل ذمہ داری پوری امت مسلمہ پر ہے نہ کہ کسی خاص فرد یا چند افراد پر۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا اجراء اولوالامر ہی کریں گے کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی ہے۔ اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہی اولوالامر ان احکام کے مخاطب اول ہیں، نہیں، مخاطب اول تو پوری جماعت ہے اور یہ اولوالامر جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ پس جب جماعت کے یہ نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ذمہ داری کا رخ آپ سے آپ اپنے مخاطب اول یعنی جماعت کی طرف ہو جاتا ہے۔ گویا ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے کہ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان پر عمل کر دیا تو ساری امت کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتے ہیں، ورنہ، بصورت دگر، پوری جماعت کے سر یہ فرائض رہ جاتے ہیں اور ایک ایک فرد اس ترکِ امر الٰہی کی پاداش میں ماخوذ ہوگا۔

اس بارے میں اگر کوئی وزنی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ یقیناً یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں گرچہ اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری جماعت ہے مگر ان کا نفاذ جب ہوگا تو ایک قوت قاہرہ یعنی حکومت ہی کے ذریعہ ہوگا۔ افراد کو اس کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ورنہ اگر ہر فرد بجائے خود اس فرض کو ذاتی طور پر انجام دینے لگے تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے اور اجتماعی زندگی تباہ اور نظم جماعت پارہ پارہ ہو جائے۔ اس لیے ایسے احکام کے اجراء یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے یا وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا "شکر" ادا کر کے اس امر پہ اظہار اطمینان کرنا چاہیے کہ

---

[۱] چنانچہ اہلِ تفسیر آیت سرقہ کی تاویل میں فرماتے ہیں:۔ یقول جل ثناؤہ من سرق من رجل او امرأۃ فاقطعوا ایھا الناس یدہ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ فلا تفرطوا ایھا المؤمنون فی اقامۃ حکمی علی السراق وغیرھم من اھل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدودا فی الدنیا یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ "اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو۔۔۔۔۔۔۔۔ اے مومنو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰ پر)

جو قرآن کے ایک حصہ پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کتاب الٰہی کو ترک اور فراموش کرنے کی قدیم سنت ضلال دہرائی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر لیجیے اور اپنے قلب اور ضمیر کی آواز پر کان لگا کر سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؛ یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہو گی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے حاصل ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرے تو اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں پہلے تو اس قوت کو حاصل کرنا اور پھر ان احکام کو نافذ کرنا۔ یہ اصول کسی بحث کا محتاج نہیں کہ جو چیز کسی فرض کی ادائگی کا ذریعہ یا موقوف علیہ ہوتی ہے، اس کی ادائگی خود فرض ہوتی ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جائے نماز ناپاک ہے، اور فوراً اس پر یہ الزام عائد کر دیں گے کہ یہ اپنا فرض ادا کرنے سے جی چرا رہا ہے اور اس کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت اور محبت نہیں، ورنہ ایسا عذر لنگ اور مضحکہ خیز بہانہ نہ کرتا اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش یا جائے نماز پاک کرنے کی تدبیر کرتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوامر قرآنی کے ایک بڑے حصہ کو معطل کر کے آپ صرف اس بنا پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ اس کے لیے جس سروسامان کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں۔ اور پھر بھی آپ کی معصومیت اور آپ کے تقویٰ پر آپ کی نگہ احتساب کوئی حرف نہیں رکھتی اور آپ کو اپنے اس عذر میں کوئی بے وقعتی اور اس بہانہ میں کوئی مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سروسامان میسر نہیں تو کیا آپ کا — بشرطیکہ اپنے عہد کا پاس اور اپنے فرض کا صحیح احساس موجود ہو — یہ دینی فرض نہیں ہو جاتا کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اس سروسامان کو حاصل کریں؟ خواہ اس کوشش میں آپ کو کیسی ہی مالی اور جانی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، اس لیے کہ یہ جان اور یہ مال آپ کی ملکیت نہیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے بلکہ جس روز آپ نے ایمان کا اقرار کیا اسی روز یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اپنی رضا کے عوض خرید لیں اور اب وہ آپ کے پاس اسی آقائے دو جہاں اور مالک جسم و جان کی امانت ہیں جس نے اپنے اوامر کی بجاآوری کا ہم سے اور آپ سے میثاق لیا ہے اور یہ امانتیں ہمارے پاس صرف اس غرض سے رکھی ہیں کہ ان اوامر کی بجاآوری میں حسب ضرورت صرف کر دی جائیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) پس جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور آپ کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اس کو عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا بدترین قسم کا کمینہ پن اور خیانت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) دیکھیے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح 'ایھا الناس' کے لفظ سے کی ہے اور دوسری جگہ "ایھا الذین آمنو" کے لفظ سے، "یا اولی الامر" کہیں نہیں کہا گیا۔ پھر مزید وضاحت یہ کر دی کہ یہ مخاطبت صرف اسی آیت سرقہ میں نہیں ہے بلکہ تمام تعزیرات اسلامی میں یہی اصول کارفرما ہے۔

اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی سعی و جہد کرے لیکن اس کا حال یہ ہے کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انھیں دور کرے اور اپنے آقا کا حکم بجا لائے، کرتا یہ ہے کہ موانع کی شکایت کرکے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگا لیتا ہے۔

قانون اضطرار کی غلط تطبیق یہ عذر تو ان احکام کے متعلق تھا جن پر کافرانہ اقتدار بالا کے باعث عمل ہو ہی نہیں سکتا، رہ گئے بعض وہ احکام جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن جو عمل بالقرآن کے ادعا کے باوجود بالکلیہ متروک ہیں مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت سے اجتناب وغیرہ، تو ان کا ترک کر دینا بھی اس وجہ سے کامل عمل بالقرآن سے خارج نہیں تصور کیا جاتا کہ ایسا "اضطرارا" کیا جاتا ہے اور اضطرار کی حالت میں ارتکاب حرام گناہ نہیں۔ لیکن ایسا یا تو اپنی اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعہ کی بنا پر کہا جاسکتا ہے یا پھر رخصت اضطرار کی لازمی حدود و قیود سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ قانون اضطرار کے الفاظ یہ ہیں:-

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ ۲۱)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچائے) بشرطیکہ اس حرام شے کے کھانے کی رغبت نہ رکھتا ہو اور نہ اس مقدار سے زیادہ کھانا چاہتا ہو جتنی کی زندگی بچانے کے لیے ضرورت ہے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (اللہ اس کو معاف کر دے گا کیونکہ) وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان الفاظ سے جہاں بحالت مجبوری ایک ممنوع فعل کے ارتکاب کی رخصت معلوم ہوتی ہے، وہیں اس رخصت کے لیے تین شرطوں کی قید بھی ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مجبوری واقعی ہو اور طلب و جستجوئے حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بیکار ہو چکی ہوں کہ بس لقمہ حرام کے سوا اب جان بچانے کا اور کوئی ممکن ذریعہ رہ نہ گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ استعمال حرام "غَيْرَ بَاغٍ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ جو ارتکاب حرام کیا جائے پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ نفرت و کراہت کے ساتھ کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارتکاب حرام بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ اگر ان تین شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک فعل حرام کا مرتکب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل معافی قرار دیتا ہے، لیکن اگر ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی تو پھر یہ وعدۂ عفو و درگذر کبھی شرمندۂ ایفا نہ ہوگا۔ شریعت اس وقت اپنی یہ رخصت واپس لے لے گی اور ایسا کرنے والا اس کی نگاہ میں نافرمان اور قابل مواخذہ قرار پائے گا۔

قانون اضطرار کی اس توضیح کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے، اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتائیے جو خداوندان باطل کے عرش فرمانروائی کے زیر سایہ رہنے، مسرفین کی اطاعت کرنے، طاغوت کا حق غلامی تسلیم کرنے، اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز اور شارع دین بننے، طاغوتی عدالتوں میں اپنے معاملات

لے جانے یا طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی احساس ناگواری اور وہی جذبۂ کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ آخر کروڑوں انسانوں کا یہ انبوہ گراں غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ غول در غول جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب واقعۃً اپنے اس فعل کو حرام ہی سمجھتے ہیں اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں اور ان میں اپنی اغراض نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکام شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ پنہاں نہیں ہوتا؟ اور وہاں صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ اور پھر یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں آئین طاغوت کے مطابق "داد انصاف" دینے میں گزار دیتے ہیں۔ درحقیقت مخمصہ کے شکار اور کسی مجبوری کے مارے ہوئے ہیں؟ اور جس وقت وہ اللہ جل مجدہٗ کے قوانین پس پشت ڈال کر شیاطین انس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیا ان کا دل اس فعل کی حرمت کا مقر اور اپنی اس فاسقانہ روش پر متنفر ہوتا ہے اور وہ بالکل غیر باغٍ وَّ لَا عَادٍ ہو کر، با دل ناخواستہ اور بصد استکراہ، اس ظلم و فسق کے اسٹیج پر بیٹھتے ہیں جس کو کرسی عدالت کہا جاتا ہے اور جہنم کے ان دہکتے ہوئے انگاروں کو ہاتھ میں لیتے ہیں جن کو روپے کے نام سے اس کارگزاری کے عوض انھیں دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی رخصت اور آمرزش کے مستحق ہیں اور ملت کو ترک کتاب الٰہی کا ملزم گرداننا سراپا ظلم و بہتان ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا، مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فی صدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ اک ذرا انصاف سے کام لے کر واقعات پر نگاہ ڈالیے، تو مشاہدہ آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اب تو ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرط اضطرار کی ضرورت کا تصور تک نہیں پیدا ہوتا، ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو معاشی خستہ حالیوں کے باعث جسم و جان کا رشتہ نہ برقرار رکھ سکتا ہو اور اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہ گیا ہو کہ بقائے حیات کے لیے یہ رزق خبیث قبول کرے۔ ان جگہوں تک تو وہی پہنچ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوں یا کم از کم یہ کہ اس مہلک افلاس میں مبتلا نہ ہوں جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے از روئے واقعہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور بالکل جائز سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ سکیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقی درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعی اضطراری حالت کی وجہ سے اس نے یہ ذریعہ معاش اختیار کیا ہوتا تو اس کے ایمان کا طبعی اقتضا یہ تھا کہ اس میں ترقی کرنے کی جدوجہد کرنے یا اس پر مطمئن ہونے کے بجائے اسے چھوڑ دینے اور کوئی جائز وسیلۂ رزق اختیار کرنے کے لیے بے چین رہتا مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کو حرام سمجھتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے وہو میں

سکون قلب کے ساتھ مشغول نہ رہتے۔ اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس منکر اعظم کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا مداہنت کرنے کے بجائے اس کے خلاف زبان اور دل سے انتہائی نفرت کا اظہار کرتے۔ کہ بقول رسولؐ یہ ایمان کی آخری حد ہے مگر یہاں حال یہ ہے کہ نہ صرف اس سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی ہے بلکہ اس کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھائی جاتی ہے اور اس کی بقا کیلئے جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جا رہی ہیں۔ کیا ایک مبغوض شئے سے یہی برتاؤ کیا جا سکتا ہے؟ آخر اتنی بڑی عظیم الشان برائی کے ساتھ ایمان کے اس کم سے کم تقاضا کا تو اظہار ہونا چاہیے جس کی حدیث بالا میں وضاحت کی گئی ہے؟ یا اس سے بھی کم ایمان کا کوئی اور درجہ ہے؟ اضطرار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے ورنہ اگر اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی اور ایک متبع قرآن اپنے نفس کی پیروی بالکل اسی بے باکی سے کر سکتا ہے جس بے باکی سے ایک منکر آخرت کرتا ہے اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم و تبیین کے لیے قرآن کا نزول اور صاحب قرآن صلعم کی بعثت ہوئی ہے۔ لیکن یاد رہے اضطرار کی یہ وہ تاویل ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے تو ابتدا میں سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتا ہے، اگر یہ جذبۂ نفرت و ملامت قوی ہو تو وہ برائی دب جاتی ہے، اور اگر یہ جذبہ اتنا کمزور ہو کہ اس برائی کو برگ و بار لانے سے نہ روک سکے تو اس کے جراثیم تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں، اب اگر اس سوسائٹی کے خواص اپنے امکان بھر اس برائی کا استیصال نہ کریں بلکہ اس کے خلاف صرف اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھیں تو رفتہ رفتہ ان کی نگاہیں بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں، اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام سب اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، اس وقت وہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن جاتی ہے اور اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اپنے مسلمہ اصول اخلاق میں تنسیخ اور تغیر تک گوارا کر لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی کہ نیکی کو پھیلاتے اور برائی کو مٹاتے رہنا، وہیں اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے منکرات اور فواحش کی روک تھام نہ کی تو تمہارے دل تک وہ اپنے جراثیم پہنچا دیں گے اور تم خدا کی عنایات سے محروم اور اس کی لعنتوں کے مستحق ہو کر رہ جاؤ گے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس زریں ہدایت کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے یہ بتلا دیا تھا کہ ایمان کی آخری حد یہ ہے کہ ہر برائی سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا دینے کے لیے اکساتی رہے۔ ورنہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں یعنی کسی برائی کو نہ صرف برضا و رغبت قبول کرنے ہی کو منافی ایمان قرار دیا ہے بلکہ اس کو دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت کا نہ محسوس کرنا بھی ویرانی قلب اور محرومی ایمان کی یقینی علامت بتایا ہے۔ مگر اب

اس تعلیم کے علمبرداروں کو اس امر پر بڑا اصرار ہے کہ ہم بلا اظہار کراہت اور بغیر کسی احساس نفرت کے غیراللہ کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے، خود قانون ساز اور شارع دین بنیں گے، طاغوت کو اپنا حکم بنائیں گے طاغوتی قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کریں گے اور پھر بھی ہمارا دین جائے گا، نہ ایمان خراب ہوگا، نہ ہماری توحید اور عبودیت میں فرق آئے گا، نہ اتباع قرآن میں فتور واقع ہوگا، نہ ہم پر کتاب الٰہی کے ترک و نسیان کا الزام وارد ہوگا، نہ ہم نقض میثاق کے مجرم ہوں گے، کیونکہ ہم حالت "اضطرار" میں ہیں۔ ع وائے گرپس امروز بود فردائے۔

اس خیال خام اور فریب نفس کے مفاسد کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ ان مذکورہ بالا احکام قرآنی کے چھوڑ بیٹھنے کے ان دور رس نتائج کو سامنے رکھ لیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل زندگی کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ غیراللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے ایک صریح حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہماری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ قالب سے بالکل مختلف ہوگا، اب ہمارے معاشرہ کی تاسیس ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی تعمیر اور ہمارے مسائل معاش و اقتصاد کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی، جو ہمارے خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی، غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جائے جو ہمارے معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیں اور دین کے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کر لیں جس کا تعلق چند مخصوص مذہبی رسوم و شعائر اور عبادات سے ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے نتائج قیاس کے دائرے سے نکل کر واقعات کے عالم میں آچکے ہیں۔ اس ملت کے علمبرداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو حکومت اور اولوالامر کے نام پر ترک کر کے اور عدم استطاعت اور اضطرار کے بہانے پیدا کر کے جن کا رہائے تاکردنی کو اختیار کیا ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے بے شمار احکام اور اصول زندگی سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور دین کے صرف ایک محدود حصہ پر وہ عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے۔ ابتدا میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے مقتضیات سے اس جبری علیحدگی پر خود ہی ایمان مضطرب ہوئی مگر امتداد زمانہ نے اس اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیا، اور اب انجام کار دماغوں پر غیر شعوری طور سے یہ وہم مستولی ہو گیا ہے کہ دین انہی چند عبادات کا نام ہے جن کو ہم ادا کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق دنیا اور دنیاداری سے ہے۔ اس لیے اس قسم کے احکام و اصول قرآنی کے متروک ہو جانے کے باوجود ہمارا تدین غیر مشکوک اور ہمارا اتباع قرآن کامل ہے۔ دراصل یہی تصور دین ہے جس نے ان احکام متروکہ کی اہمیت ہماری نگاہوں میں گھٹا دی ہے اور اس حد تک گھٹا دی ہے کہ دلوں میں ان کے بے کوئی اضطراب، کوئی تمنا اور کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دی۔ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں مگر اللہ کی بے شمار حدود کی بے حرمتی کر دیکھ کر تڑپنے کے سبب لیے

ایک دل اور بہنے کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی تیار نہیں۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ دنیا کا۔ لیکن چونکہ اِن حدود و احکام کا ذکر بھی اسی قرآن میں موجود ہے جس میں اُن چند مخصوص عبادات کا، اور ہر اس حکم کے اتباع کا عہد کیا گیا ہے جو قرآن میں ہے، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ حدود و احکام دین سے خارج ہیں لیکن جب اطاعت امر اور ادائگی فرض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی قانون اضطرار کی آڑ لینے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی احکام کی ذمہ داری سے فرار کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی و دنیا پرستی نے کافرانہ اقتدار اور کافرانہ اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈال دینے پر آمادہ کیا، اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا، اس مجبوری یا یوں کہیے کہ جبری ارتداد نے اپنی خدا پرستی اور بے گناہی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطا کار صورت چھپانے کے لیے دین کا تصور محدود اور بے روح کر دیا، ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے، ان کو دین ہی سے خارج کر دے اور ایسا بے روح کہ زندگی کے میدان وہ کہیں، ہماری اغراض کے برخلاف، مزاحم نہ ہو سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی تمام فرض ناشناسیوں، کمزوریوں اور بے عملیوں کی شناعت کا احساس فراموش کرا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار کے فقدان اور اضطرار کے حیلے آئے اور انھوں نے اس پورے سلسلۂ اوہام پر حقانیت کا پردہ ڈال دیا۔ اب یہ تمام خود ساختہ اور فاسد نظریات ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے گھیرے میں عقلیں چکرا رہی ہیں، اور ان کے سامنے راہ حقیقت اس طرح مسدود ہے کہ اب ان میں تلاش منزل کے محرکات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اگر انسان میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی نہ رہ گئی تو پھر اس کے تائب ہونے کی تمام توقعات سراب ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے اس کو جلد از جلد باز آجانا اور اپنا جرم تسلیم کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہدایت بھی عجیب شان بے نیازی رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے، مگر وہی چیز دوسروں کو ضلالت کے فتنہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ راہِ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کا راز اللہ جل مجدہٗ کی اس سنت عدل میں ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے راہ حق باز کی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کے سامنے حق کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ آفتاب کی شعاعیں ایک عالم کو منور کر دیتی ہیں مگر چشم بوم اپنی کور نگاہی کی بنا پر اس کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی یہی حال آفتاب ہدایت کی شعاعوں کا بھی ہے۔ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں، وہیں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بہتوں کے لیے وسیلۂ غوایت بھی ہوں۔ اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ اسی شخص کو راہ راست دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہیے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی حقیقی آرزو ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ قانون صرف کفار کے لیے ہے اور مومن

چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں، اس لیے اب وہ اس قانون سے آزاد ہیں۔ نہیں، یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود دراصل زندگی میں اس قرآن سے اسی وقت کسب ہدایت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص قلب کے ساتھ اس کی طلب بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی، اور زندگی کے جس معاملہ میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی اور غیر مشروط طور پر اس کی اقتدا کرنے اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، وہاں یقیناً وہ اس کو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا، اور اس امر کا کوئی لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بلکہ ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

قرآن کے ان احکام و فرامین کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں، بالکل اسی مجرمانہ بے اعتنائی سے کام لیا جارہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی، ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو جھکا دو۔ اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ کا سر کچل دو، اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو، اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو اور زانی کو درے لگاؤ، وغیرہ ذالک، تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم طلب حق لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک حکمران پارٹی کی ہے اور اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوتے تلے نہیں ہے بلکہ امامت و جہانبانی کے تخت پر ہے اور اس مسند امامت سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے کم پوزیشن میں کبھی اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی زندگی کا کتنا بلند، حریت آموز اور جاں بخش تصور تھا جو اس اسلوب بیان میں موجود اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا سبق تھا جو اس اشارۂ قرآنی میں چھپا فکر و نظر کا منتظر ہے۔ مگر قصور نظر کا برا ہو زندگی کا پیغام بھی ہمارے لیے موت کا پروانہ بن گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزۃ کے اس طرز خطاب کے راز کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کیا جاتا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی سعی کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جد و جہد کی جاتی جہاں ہمارا شہنشاہ مطلق ہم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ یہی انداز خطاب ہمارے لیے بے عملی کے جواز کی سند اور اقامت حق کی راہ کا روڑا بن گیا۔ اور یہ کہہ کر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب حکام خلافت ہیں اور اس وقت ہم کو خلافت کا اقتدار حاصل نہیں، ہم نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اتار کر پھینک دیا۔ یہ طرز فکر و عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک مسلمان جب قرآن و سنت پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ مسلمان کی تعریف اور اسلام کا معیار یہ ہے کہ وہ متقی اور صالح ہو، متواضع اور مجاہد ہو، تمام اخلاق حسنہ سے متصف اور خصائل بد سے مجتنب ہو، حدود اللہ کا پابند اور تمام حقوق کا پورا کرنے والا ہو، یہ دیکھ کر وہ اس معیار تک پہنچنے کی اس بنا پر کوشش نہ کرے کہ میں ضعیف الایمان بھلا اس مقام تک کب پہنچ سکتا ہوں، ایمان کا یہ معیار تو بلند و

تو بس صحابہ ہی کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآنی معیار ایمان سے فروتر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معیار تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کرے نہ کہ مشکلات کی فہرست سنا کر مطمئن ہو رہے۔

بالکل یہی روش آیت اضطرار کے بارے میں بھی اختیار کی گئی۔ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لازم میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز پنہاں تھا اور زندگی کے نازک سے نازک اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے مقام کی عظمت برقرار رکھنے اور اپنے مطمح نظر کا پاس رکھنے کا جو اصول پوشیدہ تھا اس کی طرف تو نظر نہیں گئی یا پہنچی ہوئی نظر کو بند کر لیا گیا لیکن فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ کی آڑ لے کر اباحت کا دروازہ کھول لیا گیا۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالت مجبوری ایک فعل حرام کے ارتکاب کی گنجائش عطا کی گئی ہے لیکن یہ اس آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو، جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ لائق اعتنا ہے، نظروں سے بالکل اوجھل ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ تم کبھی، کسی حال میں بھی، کسی امر منکر پر قلب کی ادنیٰ سے ادنیٰ رضامندی کے ساتھ نہیں جم سکتے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیش آ جائے تو اپنے تمام افکار کو اسی ایک فکر میں تحلیل کر دینا کہ کسی طرح اس دام بلا سے نجات مل جائے جس میں سوءِ اتفاق نے لا پھنسایا ہے اور جب تک یہ نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھنا کہ مردار کا سڑا ہوا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا عفونت بھری غلاظت ہے جس میں جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس حرام سے دور ہو جانے کی بالکل اسی طرح بے تابانہ کوشش کرو گے جس طرح کسی آدمی کا پاؤں نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر فوراً ہی اس کو اٹھا لینے اور کسی نرم اور ہموار زمین پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کا دیا ہوا یہ درس اگر ہم کو یاد ہوتا تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا جسے ہماری ہوائے نفس نے کلام الٰہی کو آلۂ کار بنا کر ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت، اضطرار کے نام پر قرنوں تک منکرات اور خبائث کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کا دعوی رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ کفر و فسق کی بنائی ہوئی روش پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے، اور اس کے دل میں کبھی کوئی غیرت، کوئی نفرت اور کوئی بے چینی نہیں محسوس ہوتی۔ منکرات کے ساتھ سازگاری دکھانے کے بجائے ہم ان کے خلاف مجسم احتجاج ہوتے، ہمارا ذوق ایمانی ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری غیرت اسلامی ہم کو مجبور کر دیتی کہ اس غلاظت کفر کو، جس طرح بھی ہو سکے، اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط اور اس شرط کے لوازم اور مقتضیات کو دانستہ یا نادانستہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تریاق زہر کا کام دینے لگا۔

پس اس امت کے لیے ترک کتاب الٰہی کے جرم اور اس جرم کی رسوا کن سزاؤں سے نجات پانے کی اگر کوئی راہ ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کو اس صورت حال کے بدل ڈالنے پر مرتکز کر دے جس میں وہ اپنے حاکم اعلیٰ کے فرامین سنتی ہے مگر عمل نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی، ورنہ اضطرار اور عدم استطاعت کا بہانہ کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈال کر مطمئن ہو رہی ہے۔ یہ اطمینان دراصل ایمان کے کھوکھلے ہونے یا دین کی بصیرت سے محروم ہونے کی دلیل ہے اور فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب ملت کی وہ ضعیف ترین دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہیں۔

(باقی)